# ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

**Name:**

**Registration No.:**

**Course Code: 419**

**Program: B.A**

**Semester: Autumn 2026**


WhatsApp Orders: +92 324 5836626

**ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY, ISLAMABAD**

**علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد**

**کورس :علم التعلیم • (419) سطح :بی اے**

**سمسٹر :خزاں2026**

**امتحانی مشق نمبر) 1 یونٹ 1 .تا – 5) کل نمبر100 :، کامیابی کے نمبر40 :**

**SOLVED ASSIGNMENT GUIDE**

**(For Study & Reference)**

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعے اور رہنمائی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس کو غور سے پڑھیں، تصورات کو سمجھیں اور پھر جوابات اپنی سمجھ کے مطابق اپنے الفاظ میں لکھیں۔ یہی طریقہ امتحان میں بہتر نمبروں اور حقیقی سیکھنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

## سوال نمبر :1 اسلامی تعلیمات اور انسانی کردار سازی میں تعلیم کا کردار 20) نمبر(

**سوال نمبر :1 اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسانی کردار سازی میں تعلیم کے کردار کا جائزہ لیں۔(20)**

### تعارف

انسانی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ اس کا کردار ہے۔ علم اگر کردار سے خالی ہو تو وہ محض معلومات کا انبار بن جاتا ہے جو فرد کو بھی فائدہ نہیں پہنچاتا اور معاشرے کے لیے بھی بوجھ ثابت ہوتا ہے، لیکن جب علم کردار سازی سے جُڑ جاتا ہے تو انسان اشرف المخلوقات ہونے کا حقیقی مصداق بنتا ہے۔ اسلام نے تعلیم کو کبھی محض پڑھنے لکھنے اور روزگار حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ اسے انسان کی پوری شخصیت کی تعمیر، اس کے اخلاق کی اصلاح اور اس کے باطن کی روشنی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کی پہلی وحی کا آغاز لفظ" اقرأ "سے ہوا

جس کا مفہوم صرف پڑھنا نہیں بلکہ اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھنا ہے، یعنی علم کی بنیاد ہی ایمان اور خدا شناسی پر رکھی گئی۔ اسی لیے اسلامی تعلیمات میں تعلیم اور کردار سازی لازم و ملزوم ہیں :تعلیم کا اصل ثمرہ سیرت کی بلندی ہے۔ اس جواب میں ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ جائزہ لیں گے کہ تعلیم انسانی کردار سازی میں کیا کردار ادا کرتی ہے، اس کے بنیادی اصول کیا ہیں اور آج کے دور میں اس تصور کی عملی صورتیں کیا ہو سکتی ہیں۔

کردار سے مراد انسان کے ان مستقل اخلاقی اوصاف، عادات اور رویّوں کا مجموعہ ہے جو اس کے افعال میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کردار سازی ایک تدریجی اور مسلسل عمل ہے جس میں گھر، ماحول، صحبت اور تعلیم سب شامل ہیں، لیکن ان سب میں تعلیم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کیونکہ تعلیم انسان کے شعور کو بیدار کرتی ہے، اسے اچھے اور بُرے میں تمیز سکھاتی ہے اور اس کی خواہشات کو اعلیٰ مقاصد کے تابع کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی بعثت کا مقصد خود ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ مجھے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ پوری دینی تعلیم کا محور انسان کے اخلاق و کردار کی تکمیل ہے۔ لہٰذا اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کی کامیابی کا معیار یہ نہیں کہ طالب علم کتنی معلومات رکھتا ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کے کردار میں کتنی پختگی، اس کے عمل میں کتنی سچائی اور اس کے رویّے میں کتنی نرمی اور انصاف پیدا ہوا ہے۔

## اسلام میں تعلیم اور کردار سازی کے بنیادی اصول

اسلامی تعلیمات میں کردار سازی کی بنیاد سب سے پہلے درست عقیدے پر ہے۔ جب انسان کو یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کا ایک خالق و مالک ہے، وہ اس کے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے اور ایک دن اسے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، تو اس کے اندر خود احتسابی کی ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو کسی بیرونی نگرانی سے کہیں زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ یہی احساسِ جواب دہی جھوٹ، خیانت، ظلم اور بددیانتی سے روکتا ہے اور سچائی، امانت اور عدل کی طرف مائل کرتا ہے۔ تعلیم جب یہ عقیدہ دل میں راسخ کرتی ہے تو کردار کی مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے، کیونکہ محض قوانین اور سزاؤں کا خوف انسان کو اس وقت تک روکتا ہے جب تک نگرانی موجود ہو، جب کہ ایمانی شعور ہر حال میں اس کا نگہبان رہتا ہے۔

دوسرا اصول علم اور عمل کا باہمی تعلق ہے۔ اسلام میں وہ علم مذموم ہے جس پر عمل نہ ہو۔ قرآن مجید میں ان لوگوں کی مثال گدھے سے دی گئی ہے جو کتابیں اٹھائے پھرتے ہیں مگر ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

کا قول ہے کہ علم عمل کو پکارتا ہے، اگر عمل آ جائے تو علم ٹھہر جاتا ہے ورنہ رخصت ہو جاتا ہے۔ اس اصول کے تحت اسلامی تعلیم طالب علم کو صرف جاننے والا نہیں بناتی بلکہ کرنے والا بناتی ہے۔ نماز، روزہ، زکاۃ اور حج جیسی عبادات درحقیقت کردار سازی کی عملی مشقیں ہیں :نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے، روزہ صبر اور نفس پر قابو سکھاتا ہے، زکاۃ ایثار اور ہمدردی پیدا کرتی ہے۔ یوں عبادت اور تعلیم مل کر ایک ایسا نظام بناتے ہیں جو ہر روز کردار کی آبیاری کرتا ہے۔

تیسرا اصول تزکیۂ نفس ہے۔ قرآن مجید نے نبی کریم ﷺ کے فرائض میں تلاوتِ آیات اور تعلیمِ کتاب و حکمت کے ساتھ تزکیے کو بھی شمار کیا ہے۔ تزکیے سے مراد نفس کو حسد، تکبر، لالچ، بغض اور خود غرضی جیسی بیماریوں سے پاک کرنا اور اس میں عاجزی، شکر، صبر اور قناعت جیسی صفات پیدا کرنا ہے۔ تعلیم اگر تزکیے سے خالی ہو تو وہ ذہین مگر بدکردار افراد پیدا کر سکتی ہے، اور تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کی تباہی میں اکثر پڑھے لکھے مگر کردار سے عاری لوگوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ چوتھا اصول حُسنِ اخلاق کو دین کا جوہر قرار دینا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میزان میں سب سے بھاری چیز حُسنِ اخلاق ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیم میں اخلاقی تربیت کو عبادات سے الگ کوئی ثانوی چیز نہیں بلکہ ایمان کا لازمی تقاضا سمجھا گیا ہے۔

## تعلیم کردار سازی کا ذریعہ کیسے بنتی ہے؟

تعلیم سب سے پہلے شعور اور آگاہی پیدا کر کے کردار سازی کرتی ہے۔ جاہل انسان اکثر خواہشات اور رواج کا غلام ہوتا ہے؛ وہ جو کچھ معاشرے میں دیکھتا ہے اسی کی تقلید کرتا ہے۔ علم اسے یہ صلاحیت دیتا ہے کہ وہ رواج کو پرکھے، درست اور غلط میں فرق کرے اور اپنی زندگی کے فیصلے سوچ سمجھ کر کرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بار بار غور و فکر، تدبر اور تعقل کی دعوت دیتا ہے۔ جب طالب علم کائنات، تاریخ اور انسانی زندگی پر غور کرتا ہے تو اس کے اندر عاجزی پیدا ہوتی ہے، کیونکہ حقیقی علم انسان کو اپنی محدودیت کا احساس دلاتا ہے۔ اس کے برعکس سطحی علم تکبر پیدا کرتا ہے۔ اسلامی تعلیم اس خطرے سے آگاہ کر کے طالب علم کو علم کے ساتھ تواضع سکھاتی ہے، جو اچھے کردار کی پہلی سیڑھی ہے۔

دوم، تعلیم استاد کے نمونے کے ذریعے کردار بناتی ہے۔ اسلامی روایت میں استاد صرف معلومات فراہم کرنے والا نہیں بلکہ مربی اور نمونۂ عمل ہے۔ طالب علم لفظوں سے زیادہ استاد کے عمل سے سیکھتا ہے۔ اگر استاد وقت کی پابندی،

امانت، انصاف اور شفقت کا عملی مظاہرہ کرے تو یہ اوصاف طالب علم میں ازخود منتقل ہو جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی ذات صحابہ کرام کے لیے سب سے بڑی درسگاہ تھی؛ صحابہ نے دین کو کتابوں سے زیادہ آپ ﷺ کے اسوہ سے سیکھا۔ اسی لیے اسلامی تعلیمات میں استاد کے لیے صرف علمی قابلیت کافی نہیں بلکہ اس کا صاحبِ کردار ہونا بھی شرط ہے۔ سوم، نصاب اور ماحول کردار سازی کے اہم ذرائع ہیں۔ اگر نصاب میں سیرت، تاریخِ اسلام، اخلاقی حکایات اور عظیم انسانوں کی زندگیاں شامل ہوں اور ادارے کا ماحول سچائی، صفائی، نظم و ضبط اور باہمی احترام پر مبنی ہو تو طالب علم کی شخصیت متوازن بنتی ہے۔ چہارم، تعلیم خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اسلام کے نزدیک بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ یہ تصور طالب علم کو خود غرضی سے نکال کر معاشرے کا ذمہ دار فرد بناتا ہے۔

تعلیم کردار کے مختلف پہلوؤں کو بیک وقت سنوارتی ہے۔ انفرادی سطح پر یہ سچائی، امانت داری، صبر، شکر، قناعت اور خودداری جیسی صفات پیدا کرتی ہے۔ سماجی سطح پر یہ عدل و انصاف، باہمی احترام، کمزوروں کی مدد اور حقوق العباد کی ادائیگی سکھاتی ہے۔ معاشی زندگی میں یہ حلال و حرام کی تمیز، دیانت داری اور رزقِ حلال کی اہمیت اجاگر کرتی ہے جس سے بدعنوانی اور استحصال کا خاتمہ ہوتا ہے۔ شہری زندگی میں یہ قانون کی پاسداری، صفائی، وقت کی قدر اور اجتماعی نظم کا شعور دیتی ہے۔ اس طرح اسلامی تعلیم کا بنایا ہوا کردار یک رخا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے اور انسان کو اپنے خاندان، پیشے اور قوم کے لیے نعمت بناتا ہے۔

## موجودہ دور میں اطلاق اور چیلنجز

آج کے دور میں کردار سازی کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ جدید تعلیمی نظام نے معلومات اور مہارت میں تو حیرت انگیز ترقی دی ہے مگر اخلاقی تربیت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں بدعنوان افسر، ناپ تول میں کمی کرنے والے تاجر، فراڈ کرنے والے ماہرین اور ذمہ داری سے گریز کرنے والے شہری دکھائی دیتے ہیں۔ اس صورت حال میں اسلامی تعلیمات کا کردار سازی والا تصور ایک مکمل علاج پیش کرتا ہے۔ اس کے اطلاق کے لیے ضروری ہے کہ نصاب میں اخلاقیات اور سیرت کو رسمی مضمون کے بجائے پورے تعلیمی عمل کا حصہ بنایا جائے، اساتذہ کی تربیت میں ان کے اخلاقی کردار کو اہمیت دی جائے، اداروں میں انصاف اور شفافیت کا ایسا نظام ہو جو طالب علم کے لیے عملی سبق ہو، اور نمبروں کے ساتھ ساتھ کردار کی جانچ کو بھی تعلیمی جائزے میں شامل کیا جائے۔

اس راہ میں چند چیلنجز بھی ہیں۔ مادہ پرستی اور فوری فائدے کی ثقافت نوجوانوں کو کردار کے بجائے ظاہری کامیابی کی طرف مائل کرتی ہے۔ سوشل میڈیا اور تفریحی ذرائع بعض اوقات اخلاقی اقدار کو مجروح کرتے ہیں۔ والدین اور اساتذہ کی مصروفیت نے تربیت کے لیے وقت کم کر دیا ہے۔ تاہم یہ چیلنجز ناقابلِ حل نہیں۔ اگر گھر، ادارہ اور معاشرہ تینوں مل کر ایک ہی اخلاقی پیغام دیں، استاد اور والدین خود نمونہ بنیں اور میڈیا کو تربیت کا ذریعہ بنایا جائے تو کردار سازی کا عمل دوبارہ مؤثر ہو سکتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے تعلیم کو کردار سازی سے جوڑا، انہوں نے علم، اخلاق اور تہذیب کی ایسی مثالیں قائم کیں جن سے پوری انسانیت نے فائدہ اٹھایا، اور جب یہ رشتہ ٹوٹا تو علمی زوال کے ساتھ اخلاقی انحطاط بھی آیا۔

## نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں تعلیم کا مقصد صرف ذہن کی روشنی نہیں بلکہ دل کی روشنی بھی ہے۔ درست عقیدہ، علم و عمل کا اتحاد، تزکیۂ نفس اور حُسنِ اخلاق وہ اصول ہیں جن پر اسلامی کردار سازی کی عمارت کھڑی ہے۔ تعلیم شعور دے کر، استاد کے نمونے کے ذریعے، ماحول اور نصاب کی اصلاح سے اور خدمتِ خلق کا جذبہ جگا کر انسان کے کردار کو سنوارتی ہے۔ موجودہ دور کے اخلاقی بحران کا حل بھی اسی تصور کی طرف واپسی میں ہے، بشرطیکہ اسے نعروں کے بجائے تعلیمی نظام، اساتذہ کی تربیت اور گھریلو ماحول میں عملی شکل دی جائے۔ ایسا تعلیم یافتہ انسان ہی اپنی ذات کے لیے سکون، اپنے خاندان کے لیے سہارا اور اپنی قوم و انسانیت کے لیے رحمت ثابت ہو سکتا ہے۔

# سوال نمبر :2 اسلامی اور مغربی تعلیمی افکار کے بنیادی اختلافات 20) نمبر(

**سوال نمبر :2 اسلامی اور مغربی تعلیمی افکار کے بنیادی اختلافات کی وضاحت کریں۔(20)**

## تعارف

تعلیم محض تدریسی طریقوں کا نام نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک پورا فلسفۂ زندگی کارفرما ہوتا ہے۔ ہر تعلیمی نظام یہ طے کرتا ہے کہ انسان کیا ہے، علم کیا ہے، زندگی کا مقصد کیا ہے اور اچھا معاشرہ کیسا ہوتا ہے۔ انہی بنیادی سوالات کے جوابات میں اسلامی اور مغربی تعلیمی افکار ایک دوسرے سے نمایاں طور پر مختلف ہیں۔ اسلام کی تعلیمی فکر

وحی پر مبنی ہے اور اس کا محور اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی ہے، جب کہ جدید مغربی تعلیمی فکر بڑی حد تک عقل، تجربے اور مادی ترقی پر مبنی ہے اور اس کا محور دنیوی زندگی کی بہتری قرار پاتا ہے۔ یہ اختلاف تعلیم کے مقاصد، نصاب، استاد کے مقام، طالب علم کے تصور اور اخلاقی تربیت سمیت نظام کے ہر حصے میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس جواب میں پہلے دونوں افکار کی بنیادیں بیان کی جائیں گی اور پھر ان کے بنیادی اختلافات کی ترتیب وار وضاحت پیش کی جائے گی تاکہ طالب علم دونوں نظاموں کی نوعیت کو واضح طور پر سمجھ سکے۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مغربی تعلیمی فکر ایک ہی رنگ کی نہیں؛ اس میں روسو، پیسٹالوزی، فرائیبل، ڈیوی اور دیگر بہت سے مفکرین کے متنوع نظریات موجود ہیں۔ اسی طرح اسلامی فکر میں بھی مختلف مکاتب پائے جاتے ہیں۔ تاہم بنیادی اصولوں کی سطح پر ایک واضح حدِ فاصل موجود ہے جس کی نشان دہی اس سوال کا مقصود ہے۔ اختلاف بیان کرنے کا مطلب کسی ایک فکر کی مکمل نفی نہیں؛ مقصد یہ ہے کہ طالب علم یہ جانے کہ دونوں نظام کس نقطۂ آغاز سے چلتے ہیں اور اسی فرق سے ان کے نتائج میں فرق کیوں پیدا ہوتا ہے۔ جدید دور میں مسلمان ممالک کا تعلیمی نظام عموماً مغربی ڈھانچے پر قائم ہے، اس لیے ان اختلافات کی آگاہی خاص طور پر اہم ہے تاکہ جو کچھ لینا ہے سوچ سمجھ کر لیا جائے اور جو اپنی اقدار سے متصادم ہو اس سے بچا جا سکے۔

## اسلامی اور مغربی تعلیمی فکر کی بنیادیں

اسلامی تعلیمی فکر کی پہلی بنیاد توحید ہے۔ اس فکر کے مطابق کائنات کا خالق اور مالک اللہ ہے، انسان اس کی مخلوق اور زمین پر اس کا خلیفہ ہے، اور علم کی اصل سرچشمہ وحی ہے جس کی روشنی میں عقل اور تجربہ رہنمائی پاتے ہیں۔ علم کو اسلام میں دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا کہ کچھ علم دینی ہے اور کچھ دنیوی؛ تمام نفع بخش علم دین کے دائرے میں داخل ہے بشرطیکہ اس کا مقصد درست ہو۔ ریاضی، طب، فلکیات اور زراعت کے علوم بھی اگر اللہ کی رضا اور انسانیت کی خدمت کے لیے حاصل کیے جائیں تو عبادت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی بنیاد پر اسلامی تاریخ میں مسجد اور مدرسہ علم کے مراکز رہے اور عالم کو انبیا کا وارث قرار دیا گیا۔ تعلیم کا مقصد انسان کو عبدِ صالح اور مفید شہری بنانا، اس کی روحانی، اخلاقی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کی متوازن نشوونما کرنا اور اسے دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی کے قابل بنانا ہے۔

مغربی تعلیمی فکر کی بنیاد انسانی عقل اور مشاہدے پر ہے۔ نشاۃِ ثانیہ، اصلاحِ مذہب اور سائنسی انقلاب کے بعد مغرب میں مذہب کو بتدریج تعلیم سے الگ کر دیا گیا اور سیکولر نقطہ نظر غالب آ گیا۔ اس فکر کے مطابق علم کا معیار وہ ہے جو تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہو۔ تعلیم کا مقصد عام طور پر فرد کی ذہنی صلاحیتوں کی نشوونما، پیشہ ورانہ مہارت، معاشی ترقی اور جمہوری معاشرے کے لیے موزوں شہری تیار کرنا قرار پاتا ہے۔ مختلف مفکرین نے اس میں اضافے کیے :روسو نے فطری نشوونما پر زور دیا، ہربرٹ سپنسر نے زندگی کی تیاری کو مقصد قرار دیا، جان ڈیوی نے تعلیم کو خود زندگی اور جمہوری تجربہ کہا لیکن ان سب میں مشترک بات یہ ہے کہ آخری حوالہ انسان کی دنیوی زندگی ہے؛ آخرت، وحی اور روحانی تربیت کو یا تو نظر انداز کیا جاتا ہے یا اسے فرد کا نجی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔

## بنیادی اختلافات کی وضاحت

پہلا اور سب سے بنیادی اختلاف علم کے ماخذ کا ہے۔ اسلامی فکر میں علم کا اعلیٰ ترین ماخذ وحی ہے؛ قرآن و سنت وہ حقائق بھی بتاتے ہیں جو عقل اور حواس کی رسائی سے باہر ہیں، جیسے آخرت، فرشتے اور تقدیر۔ عقل اور تجربہ وحی کے تابع رہ کر کام کرتے ہیں۔ مغربی فکر میں وحی کو علم کا ماخذ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ علم صرف وہی ہے جو عقل، حواس اور تجربے سے حاصل ہو۔ اسی ایک فرق سے پورے نظام کی سمت بدل جاتی ہے، کیونکہ جس ماخذ کو حتمی مانا جائے وہی مقاصد اور اقدار طے کرتا ہے۔

دوسرا اختلاف مقصدِ تعلیم کا ہے۔ اسلام میں تعلیم کا حتمی مقصد اللہ کی معرفت، اس کی رضا اور آخرت کی نجات ہے؛ دنیوی کامیابی اس مقصد کے تابع اور اس کا ذریعہ ہے۔ مغربی فکر میں مقصد دنیوی ہے :روزگار، ترقی، سماجی مقام اور لذت بخش زندگی۔ نتیجتاً اسلامی تعلیم میں اخلاقی اور روحانی تربیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے جب کہ مغربی تعلیم میں مہارت اور کارکردگی مقدم رہتی ہے۔ تیسرا اختلاف انسان کے تصور کا ہے۔ اسلام انسان کو جسم اور روح کا مجموعہ اور اللہ کا خلیفہ سمجھتا ہے جس کے سپرد امانت ہے اور جو اپنے اعمال کا جواب دہ ہے۔ مغربی فکر کی غالب صورتوں میں انسان کو ایک حیاتیاتی و سماجی وجود سمجھا جاتا ہے جس کی ضروریات اور خواہشات ہی اس کے عمل کی بنیاد ہیں۔ چوتھا اختلاف علم کی وحدت اور تقسیم کا ہے۔ اسلام علم کو ایک وحدت مانتا ہے؛ دینی و دنیوی کی تقسیم اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ مغرب میں علم کو مذہبی اور سیکولر خانوں میں بانٹا گیا اور پھر مذہبی علم کو تعلیمی نظام سے بتدریج خارج کر دیا گیا۔

پانچواں اختلاف اخلاقی تربیت کے مقام کا ہے۔ اسلامی تعلیم میں اخلاق نصاب کا الگ مضمون نہیں بلکہ ہر مضمون اور ہر عمل میں شامل ہے، کیونکہ مذہب اور اخلاق لازم و ملزوم ہیں اور اخلاق کا ماخذ وحی ہے جو ثابت اور غیر متبدل ہے۔ جدید مغربی فکر میں اخلاق کو نسبی اور بدلتی ہوئی سماجی اقدار کے تابع سمجھا جاتا ہے، اس لیے اخلاقی اصول متعین نہیں رہتے۔ چھٹا اختلاف استاد کے مقام کا ہے۔ اسلام میں استاد مربی، نمونۂ اخلاق اور انبیا کا وارث ہے؛ اس کا احترام عبادت کے قریب درجہ رکھتا ہے۔ مغربی نظام میں استاد بنیادی طور پر ایک پیشہ ور ماہر ہے جو تدریسی خدمت فراہم کرتا ہے۔ ساتواں اختلاف انفرادی و اجتماعی مقاصد کے توازن کا ہے۔ اسلام فرد کی نشوونما کو معاشرے کی فلاح سے جوڑتا ہے اور حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد پر برابر زور دیتا ہے۔ مغربی فکر میں یا تو فرد کی آزادی مقدم ہے جیسے لبرل روایت میں، یا ریاست و معاشرہ مقدم ہے جیسے بعض اجتماعی نظریات میں۔ آٹھواں اختلاف کامیابی کے معیار کا ہے :اسلام میں کامیاب انسان وہ ہے جو دنیا میں ذمہ داریاں نبھائے اور آخرت میں سرخرو ہو، جب کہ مغربی معیار عموماً دولت، منصب اور شہرت سے ناپا جاتا ہے۔

**جدول 1: اسلامی اور مغربی تعلیمی افکار کا تقابلی جائزہ**

| پہلو | اسلامی تعلیمی فکر | مغربی تعلیمی فکر |
|---|---|---|
| ماخذِ علم | وحی) قرآن و سنت (سرچشمہ، عقل و تجربہ اس کے تابع | عقل، حواس اور تجربہ ہی علم کا ماخذ |
| مقصدِ تعلیم | اللہ کی رضا، آخرت کی کامیابی اور عبدِ صالح کی تیاری | دنیوی کامیابی، روزگار، مہارت اور سماجی ترقی |
| تصورِ انسان | جسم و روح کا مجموعہ، اللہ کا خلیفہ اور جواب دہ | حیاتیاتی و سماجی وجود، خواہشات کا تابع |
| اخلاق کا مقام | تعلیم کا جوہر، وحی سے ثابت اقدار | اخلاق نسبی اور سماجی اقدار کے تابع |
| استاد کا مقام | مربی، نمونۂ عمل، انبیا کا وارث | پیشہ ور ماہر اور تدریسی خدمت گار |

| | | |
|---|---|---|
| کامیابی کا معیار | دنیا کی ذمہ داری اور آخرت کی سرخروئی | دولت، منصب، شہرت اور کارکردگی |

## دونوں افکار کے مشترک پہلو اور متوازن جائزہ

اختلافات کے باوجود دونوں افکار میں کچھ قدرِ مشترک بھی پائی جاتی ہے جس کا اعتراف انصاف کا تقاضا ہے۔ دونوں جہالت کو بُرا اور علم کو انسان کی عظمت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ دونوں بچے کی فطری صلاحیتوں کے احترام، تدریج، مشاہدے اور تجربے سے سیکھنے کو اہم مانتے ہیں؛ مسلم مفکرین میں سے ابن خلدون اور امام غزالی نے بھی تدریج، تکرار اور بچے کی ذہنی استعداد کے لحاظ سے تدریس پر زور دیا تھا۔ مغربی فکر کی جن خوبیوں سے استفادہ ممکن ہے ان میں سائنسی طریقۂ تحقیق، تجرباتی تدریس، ابتدائی تعلیم کی تنظیم، اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت اور تعلیم کی منصوبہ بندی شامل ہیں۔ اسلام طریقوں اور وسائل کے باب میں دوسروں سے سیکھنے سے نہیں روکتا؛ حکم ہے کہ حکمت مومن کی گم شدہ میراث ہے جہاں ملے اسے لے لے۔ اصل احتیاط مقاصد اور اقدار کے باب میں ہے، جہاں وحی کی رہنمائی سے انحراف پورے نظام کو اپنی تہذیبی بنیاد سے کاٹ دیتا ہے۔

عملی صورت حال یہ ہے کہ پاکستان سمیت بیشتر مسلم ممالک کا تعلیمی ڈھانچہ نوآبادیاتی دور سے مغربی خطوط پر چلا آ رہا ہے۔ اس ڈھانچے نے جدید علوم کی توسیع اور پیشہ ورانہ تعلیم میں فائدہ دیا، لیکن ساتھ ہی وہ مسائل بھی پیدا کیے جو مقصد سے خالی تعلیم سے پیدا ہوتے ہیں :اخلاقی بحران، زبان و ثقافت سے بیگانگی اور تعلیم کا صرف نوکری سے جُڑ جانا۔ اس کا حل نہ مغرب کی اندھی تقلید ہے اور نہ جدید علوم سے کنارہ کشی، بلکہ یہ ہے کہ مقاصد اور اقدار اسلامی اصولوں سے لیے جائیں اور جدید تدریسی طریقے، سائنسی تحقیق اور تنظیم کے وسائل کو ان مقاصد کے تابع کر کے اختیار کیا جائے۔ یہی متوازن راستہ ہماری تعلیمی پالیسی کی بنیاد ہونا چاہیے۔

## نتیجہ

نتیجتاً اسلامی اور مغربی تعلیمی افکار کا بنیادی اختلاف ماخذِ علم، مقصدِ تعلیم، تصورِ انسان، اخلاق کے مقام اور کامیابی کے معیار میں ہے۔ اسلامی فکر وحی کی رہنمائی میں دنیا و آخرت کی متوازن تعمیر چاہتی ہے، جب کہ مغربی فکر کا دائرہ عموماً دنیوی زندگی تک محدود ہے۔ یہ اختلاف سطحی نہیں بلکہ ہر نظام کے پورے کردار کا تعین کرتا

ہے۔ طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں افکار کو ان کی بنیادوں سے سمجھے، مغربی فکر کے کارآمد طریقوں سے استفادہ کرے مگر اپنی تعلیم کی روح اور سمت اسلامی اصولوں کے مطابق رکھے۔ یہی آگاہی ہمارے تعلیمی نظام کی اصلاح کی پہلی شرط ہے۔

## سوال نمبر :3 عہدِ نبوی ﷺ اور خلافتِ راشدہ میں تعلیم کے انتظامی پہلو 20) نمبر(

**سوال نمبر :3 عہدِ نبوی ﷺ اور خلافتِ راشدہ میں تعلیم کے انتظامی پہلوؤں پر بحث کریں۔(20)**

### تعارف

اسلامی تعلیم کی تاریخ کا آغاز کسی بڑی درسگاہ یا سرکاری محکمے سے نہیں ہوا بلکہ ایک ایسی سادہ اور منظم کوشش سے ہوا جس کی بنیاد مسجد، استاد اور مخلص طالب علم تھے۔ عہدِ نبوی ﷺ اور خلافتِ راشدہ کا دور اس لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں تعلیم کا ایک مکمل انتظامی تصور عملی شکل میں سامنے آتا ہے :مقصد واضح تھا، ذرائع سادہ مگر منظم تھے، اساتذہ کی تقرری میرٹ پر ہوتی تھی اور نگرانی خود براہِ ریاست کے ہاتھ میں تھی۔ اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں تعلیم کو چند افراد کا ذاتی کام نہیں چھوڑا گیا بلکہ ریاست اور معاشرے نے اسے اپنی اجتماعی ذمہ داری سمجھا۔ اس جواب میں عہدِ نبوی ﷺ کے تعلیمی انتظام کا جائزہ لیا جائے گا، پھر خلافتِ راشدہ میں اس نظام کی توسیع اور ادارہ سازی بیان ہوگی، اور آخر میں اس دور کی ان انتظامی خصوصیات کی نشان دہی کی جائے گی جو آج کے تعلیمی نظام کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

یہ جائزہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس دور میں تعلیم بے ترتیبی سے پھیلتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ وسائل کی کمی کے باوجود منصوبہ بندی، درجہ بندی، اساتذہ کا انتخاب، نصاب کی تعیین اور دور دراز علاقوں تک رسائی جیسے تمام انتظامی عناصر کسی نہ کسی صورت موجود تھے۔ صفہ کا ادارہ، کاتبینِ وحی کی جماعت، مختلف قبائل اور علاقوں میں بھیجے گئے معلمین، جنگِ بدر کے قیدیوں سے پڑھانے کا انتظام اور خلفائے راشدین کے دور میں مفتوحہ شہروں میں اساتذہ کی تقرری و وظائف، یہ سب اسی منظم سوچ کے شواہد ہیں۔

## عہدِ نبوی ﷺ میں تعلیمی انتظام

مدینہ منورہ میں تعلیمی نظام کا مرکز مسجدِ نبوی تھی۔ مسجد صرف عبادت گاہ نہیں تھی بلکہ وہ درسگاہ، عدالت، مجلسِ شوریٰ اور سماجی مرکز کا کام بھی دیتی تھی۔ مسجد کے ایک حصے میں صفہ نامی چبوترہ ان صحابہ کے لیے مخصوص تھا جنہوں نے اپنا سب کچھ چھوڑ کر خود کو علم کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اصحابِ صفہ کی تعداد مختلف اوقات میں بدلتی رہی اور ان کی کفالت خود نبی کریم ﷺ اور اہلِ مدینہ کے تعاون سے ہوتی تھی۔ یہ اسلامی تاریخ کا پہلا باقاعدہ اقامتی تعلیمی ادارہ تھا جس میں طلبہ کو رہائش، خوراک اور تعلیم مفت حاصل تھی اور ان کا پورا وقت حصولِ علم کے لیے مخصوص تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی انتظام میں طلبہ کی بنیادی ضروریات کی کفالت کو بھی انتظامی ذمہ داری سمجھا گیا۔

اساتذہ کی تقرری عہدِ نبوی کے انتظام کا دوسرا اہم پہلو ہے۔ نبی کریم ﷺ خود سب سے بڑے معلم تھے، لیکن آپ ﷺ نے مخصوص صحابہ کو مخصوص علوم کی تعلیم پر مامور کیا: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا گیا اور انہیں قرآن، حلال و حرام اور فرائض کی تعلیم کی ذمہ داری دی گئی؛ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہجرت سے پہلے مدینہ بھیجے گئے تاکہ اہلِ مدینہ کو قرآن پڑھائیں؛ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو قرآن کی تعلیم میں خاص درجہ حاصل تھا۔ جنگِ بدر کے پڑھے لکھے قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر ہوا کہ وہ دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں؛ یہ اس دور کی انتظامی ذہانت کی عمدہ مثال ہے کہ انسانی وسائل کو تعلیم کے فروغ کے لیے استعمال کیا گیا۔ اساتذہ کے انتخاب میں علمی قابلیت کے ساتھ اخلاقی کردار اور نرمی کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا، اور معلمین کو ہدایت تھی کہ آسانی پیدا کریں، تنگی نہ پیدا کریں اور خوش خبری دیں، نفرت نہ دلائیں۔

نصاب اور نگرانی کا پہلو بھی اس انتظام میں واضح ہے۔ ابتدائی نصاب کا مرکز قرآن مجید تھا: اس کی تلاوت، حفظ، مفاہیم اور احکام۔ اس کے ساتھ لکھنے پڑھنے کی مہارت، حساب کی بنیادی آگاہی اور اخلاقی تربیت شامل تھی۔ علم کو عملی زندگی سے جوڑا جاتا تھا؛ جو آیت نازل ہوتی صحابہ اسے سمجھ کر اس پر عمل کرتے، کہا جاتا ہے کہ وہ دس آیات سیکھ کر آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان کے علم و عمل میں پختگی نہ آ جائے۔ نگرانی کا نظام ذاتی دلچسپی پر مبنی تھا: نبی کریم ﷺ خود مجلسوں میں تشریف لاتے، سوالات کرتے اور جوابات سنتے، اور جب کوئی وفد کسی علاقے سے آتا تو اسے تعلیم دے کر واپس بھیجا جاتا تاکہ وہ اپنے علاقے کا معلم بن جائے۔ یہ طریقہ تربیت یافتہ اساتذہ کی تیاری اور تعلیم کی مرکز سے اطراف تک منتقلی کا سادہ مگر مؤثر نظام تھا۔ لکھائی کے انتظام کے لیے کاتبینِ وحی کی

باقاعدہ جماعت موجود تھی جن میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نمایاں ہیں، اور انہیں غیر ملکی زبان سیکھنے کی ذمہ داری بھی دی گئی تاکہ بیرونی خط کتابت کا انتظام درست رہے۔

## خلافتِ راشدہ میں تعلیمی انتظام کی توسیع

خلافتِ راشدہ میں اسلامی ریاست کی حدود وسیع ہوئیں تو تعلیمی انتظام کو بھی وسعت اور ادارتی شکل ملی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور کا سب سے بڑا تعلیمی و انتظامی کارنامہ جمعِ قرآن ہے۔ جنگِ یمامہ میں حفاظ کی بڑی تعداد کی شہادت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تجویز پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں قرآن کو ایک مصحف میں جمع کیا گیا۔ یہ درحقیقت نصاب کے بنیادی ماخذ کا تحفظ تھا، کیونکہ جس کتاب پر پورا تعلیمی نظام قائم تھا اس کی حفاظت کے بغیر تعلیم کا تسلسل ممکن نہ تھا۔ اسی دور میں مفتوحہ علاقوں میں قرآن کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور سرحدی چھاؤنیوں میں بھی دینی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں تعلیمی انتظام باقاعدہ ریاستی ذمہ داری بن گیا۔ آپ نے کوفہ، بصرہ، شام اور مصر جیسے بڑے شہروں میں ممتاز صحابہ کو معلم اور قاضی مقرر کر کے بھیجا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بصرہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بعد دیگر صحابہ کو شام کی تعلیم سونپی گئی۔ اساتذہ کے لیے بیت المال سے وظائف مقرر کیے گئے تاکہ وہ معاشی فکروں سے آزاد ہو کر تدریس کریں۔ بچوں کے لیے مکاتب کا سلسلہ پھیلا جہاں قرآن، پڑھنا لکھنا اور بنیادی حساب سکھایا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود بازاروں اور محلوں کا دورہ کر کے حالات کی جانچ کرتے اور خطوط کے ذریعے گورنروں کو تعلیم اور عدل کی ہدایات دیتے رہے؛ یہ نگرانی و احتساب کا وہ نظام ہے جو آج کے انتظامی تصورات سے حیرت انگیز طور پر ملتا جلتا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور کا عظیم کارنامہ قرآن مجید کے ایک متفقہ نسخے کی تیاری اور اس کی نقول تمام بڑے شہروں میں بھیجنا ہے۔ قراءت کے اختلافات کو ختم کرنے کے لیے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی کمیٹی نے سرکاری نسخہ تیار کیا اور ہر نسخے کے ساتھ مستند قاری بھی بھیجا گیا تاکہ پڑھانے کا طریقہ یکساں رہے۔ یہ نصاب کی یکسانیت اور معیار بندی کا ابتدائی مگر نہایت اہم اقدام تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں کوفہ علمی مرکز بن گیا؛ آپ خود پیچیدہ مسائل کی تدریس فرماتے، اور آپ کی ہدایت پر ابو الاسود دؤلی نے علمِ نحو کی

بنیاد رکھی تاکہ غیر عرب مسلمان قرآن کو درست پڑھ سکیں۔ یوں خلافتِ راشدہ میں تعلیم کا انتظام چار سمتوں میں آگے بڑھا: ماخذِ علم کا تحفظ، اساتذہ کی تقرری و کفالت، نصاب کی یکسانیت اور نگرانی و احتساب۔

## اس دور کی انتظامی خصوصیات اور آج کے لیے اسباق

اس پورے دور کی انتظامی خصوصیات کو چند نکات میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ اول، تعلیم ریاست اور معاشرے کی مشترکہ ذمہ داری تھی اور اس پر اخراجات بیت المال اور عوامی تعاون سے ہوتے تھے، اس لیے تعلیم مفت اور سب کے لیے یکساں تھی؛ امیر و غریب، عرب و عجم کی کوئی تفریق نہ تھی۔ دوم، استاد کا انتخاب قابلیت اور کردار کی بنیاد پر ہوتا تھا اور اسے معاشرے میں سب سے باعزت مقام حاصل تھا۔ سوم، تعلیم کا مرکز مسجد تھی جس سے اخراجات کم اور رسائی زیادہ ہو گئی۔ چہارم، نصاب زندگی سے جُڑا ہوا تھا؛ قرآن کے ساتھ عملی مہارتیں، خط کتابت، حساب اور حتیٰ کہ تیراکی و نشانہ بازی جیسی جسمانی تربیت بھی شامل تھی۔ پنجم، مرکزی نگرانی کے ساتھ ساتھ مقامی سطح پر خود اختیاری موجود تھی؛ معلمین اپنے علاقوں کے حالات کے مطابق طریقے اختیار کر سکتے تھے۔ ششم، خواتین کی تعلیم کا بھی اہتمام تھا؛ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بڑی عالمہ تھیں جن سے اکابر صحابہ مسائل پوچھتے تھے اور خواتین کے لیے الگ مجلسوں کی درخواستیں قبول کی جاتیں۔

آج کے تعلیمی نظام کے لیے اس دور سے چند واضح اسباق ملتے ہیں۔ پہلا سبق یہ ہے کہ تعلیم کو محض محکمانہ کارروائی کے بجائے قومی فریضہ سمجھا جائے اور اس کے لیے مستقل وسائل مہیا کیے جائیں۔ دوسرا سبق اساتذہ کے انتخاب میں میرٹ اور کردار اور ان کی معاشی کفالت کی اہمیت ہے؛ جو معاشرہ استاد کو فکرِ معاش میں مبتلا رکھے وہ اچھی تعلیم کی توقع نہیں رکھ سکتا۔ تیسرا سبق نصاب کے بنیادی ماخذات کے تحفظ اور معیار بندی کا ہے۔ چوتھا سبق یہ ہے کہ نگرانی کا نظام سزا سے زیادہ اصلاح اور رہنمائی پر مبنی ہو۔ اور پانچواں سبق رسائی کی سادگی ہے: اسکول کی عمارت کی شان سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ہر بچے تک مستند استاد اور مفید علم پہنچے۔ اگر یہ اصول آج کے انتظامی ڈھانچے میں شامل کر لیے جائیں تو ہمارا نظام اپنی اصل روح سے دوبارہ جُڑ سکتا ہے۔

## نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ میں تعلیمی انتظام کی بنیاد رکھی گئی: مسجد و صفہ مرکز بنے، اساتذہ قابلیت سے منتخب ہوئے، نصاب قرآن و عملی زندگی پر مشتمل ہوا اور نگرانی ذاتی دلچسپی سے ہوئی۔ خلافتِ راشدہ میں یہ نظام ریاست

کی وسعت کے ساتھ پھیلا :قرآن جمع اور یکساں نسخے میں محفوظ ہوا، شہروں میں معلمین مقرر ہوئے، وظائف جاری ہوئے اور احتساب کا نظام قائم ہوا۔ وسائل کی کمی کے باوجود اس دور نے یہ ثابت کر دیا کہ تعلیمی انتظام کی اصل روح بڑی عمارتیں نہیں بلکہ واضح مقصد، اہل استاد، مفت رسائی اور مخلص نگرانی ہے۔ یہی چار عناصر آج کے نظام کی اصلاح کی بنیاد بن سکتے ہیں۔

## سوال نمبر :4 برصغیر میں جدید تعلیم اور نوآبادیاتی دور کے اثرات 20) نمبر(

**سوال نمبر :4 برصغیر میں جدید تعلیم کے فروغ میں نوآبادیاتی دور کے اثرات بیان کریں۔(20)**

### تعارف

برصغیر میں تعلیم کی تاریخ بہت قدیم ہے، لیکن جدید تعلیم کا وہ ڈھانچہ جسے ہم آج دیکھتے ہیں — اسکول، کالج، یونیورسٹی، نصابی کتب، امتحانات اور ڈگریاں — بڑی حد تک نوآبادیاتی دور کی پیداوار ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر برطانوی حکومت نے یہاں ایک ایسا تعلیمی نظام قائم کیا جس کا مقصد بظاہر علم کا فروغ تھا مگر اس کی جڑیں نوآبادیاتی انتظامی ضروریات میں پیوست تھیں۔ اس نظام نے برصغیر کے سماج، زبانوں، علوم اور ذہنیت پر گہرے اور دیرپا اثرات چھوڑے، جن میں سے کچھ تعمیری بھی تھے اور کچھ ایسے منفی تھے جن کے بوجھ سے یہ خطہ آج تک نکل نہیں سکا۔ اس جواب میں پہلے مقامی تعلیمی نظام کا مختصر پس منظر، پھر نوآبادیاتی تعلیم کی تشکیل کے مراحل، اور اس کے بعد اس کے مثبت اور منفی اثرات کا متوازن جائزہ پیش کیا جائے گا۔

اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نوآبادیاتی تعلیم یہاں کے باشندوں کی فلاح کے منصوبے کے طور پر نہیں آئی تھی۔ اس کے بنیادی محرکات تین تھے :انتظامی مشینری کے لیے سستے مقامی اہلکار تیار کرنا، برطانوی مصنوعات اور اقدار کے لیے ذہنی فضا بنانا، اور مقامی آبادی کو حکمران تہذیب سے متاثر کر کے وفادار رکھنا۔ لارڈ میکالے کے مشہور الفاظ اسی سوچ کا اظہار ہیں کہ ہمیں ایک ایسی جماعت پیدا کرنی ہے جو خون و رنگت میں ہندوستانی ہو مگر ذوق، رائے اور اخلاق میں انگریز ہو۔ اس مقصدیت کو سامنے رکھے بغیر اس دور کے اثرات کو درست طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔

## نوآبادیاتی دور سے پہلے کا مقامی نظام اور جدید تعلیم کا آغاز

برطانوی اقتدار سے پہلے برصغیر میں مکاتب و مدارس کا وسیع جال موجود تھا۔ ہر مسجد کے ساتھ مکتب ہوتا تھا جہاں بچے قرآن، اردو، فارسی، حساب اور اخلاقیات سیکھتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے مدارس میں منطق، فلسفہ، فقہ، حدیث، طب اور ریاضی پڑھائی جاتی تھی اور درسِ نظامی جیسا منظم نصاب رائج تھا۔ ہندو برادری کے پاٹھ شالے اور گروکل بھی اسی طرح کام کرتے تھے۔ یہ نظام مفت یا قلیل فیس پر چلتا تھا، اساتذہ کو جاگیروں اور اوقاف سے معاوضہ ملتا تھا اور تعلیم کا مقصد کردار سازی اور سماجی خدمت تھا۔ اس نظام میں اپنی کمزوریاں بھی تھیں، مثلاً سائنسی تجربات اور جدید تحقیق سے دوری، لیکن یہ یہاں کی زبانوں، مذہب اور ثقافت سے مکمل ہم آہنگ تھا اور آبادی کی بڑی اکثریت کے لیے قابلِ رسائی تھا۔

جدید تعلیم کا آغاز کمپنی کے دور میں ہوا۔ 1813 کے چارٹر ایکٹ میں تعلیم کے لیے سالانہ ایک لاکھ روپے مختص کیے گئے جس سے یہ بحث شروع ہوئی کہ رقم مشرقی علوم پر خرچ ہو یا انگریزی علوم پر۔ یہ تنازعہ 1835 میں میکالے کے یادگار منٹ اور لارڈ بنٹنک کے فیصلے سے ختم ہوا: انگریزی زبان اور مغربی علوم کو سرکاری سرپرستی مل گئی اور فارسی کی جگہ دفتری زبان کے طور پر بھی انگریزی کا غلبہ ہو گیا۔ 1854 میں سر چارلس وڈ کے ڈسپیچ نے اس نظام کو مکمل شکل دی جسے برصغیر میں جدید تعلیم کا میگنا کارٹا کہا جاتا ہے: پرائمری سے یونیورسٹی تک درجہ بند نظام، محکمۂ تعلیم کا قیام، اساتذہ کی تربیت کے ادارے اور گرانٹ ان ایڈ کا نظام اسی کی سفارشات تھیں۔ 1857 میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں اور بعد میں پنجاب یونیورسٹی (1882) اور الٰہ آباد یونیورسٹی (1887) وجود میں آئیں۔

## جدید تعلیم کے فروغ پر مثبت اثرات

نوآبادیاتی تعلیم کے مثبت اثرات سے انکار ممکن نہیں۔ سب سے پہلا اثر جدید علوم تک رسائی ہے۔ طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، جدید طب، جغرافیہ، تاریخ کا تنقیدی مطالعہ اور جدید معاشی و سیاسی افکار اسی نظام کے ذریعے برصغیر میں آئے اور یہاں کے ذہنوں میں تحقیق و جستجو کی نئی روشنی پیدا ہوئی۔ دوسرا اثر چھاپے خانے اور اخبارات کی توسیع ہے؛ تعلیم کے فروغ کے ساتھ صحافت پروان چڑھی جس نے سیاسی شعور اور سماجی اصلاح کی تحریکوں کو جنم دیا۔ تیسرا اثر اصلاحی و تجدیدی تحریکوں کی پیدائش ہے: سرسید احمد خان نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

(1875)قائم کر کے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا، دارالعلوم دیوبند (1866) اور ندوۃ العلماء جیسے اداروں نے دینی تعلیم کو نئے اسلوب سے منظم کیا، اور انجمن حمایتِ اسلام اور سنگھ سبھا جیسی تنظیموں نے تعلیمی ادارے کھولے۔

چوتھا اثر خواتین کی تعلیم کا آغاز ہے۔ روایتی معاشرے میں لڑکیوں کی رسمی تعلیم کا تصور محدود تھا؛ نوآبادیاتی دور میں لڑکیوں کے اسکول قائم ہوئے اور بتدریج خواتین کی تعلیم کو سماجی قبولیت ملی جس کا سفر آج تک جاری ہے۔ پانچواں اثر ایک مشترکہ رابطے کی زبان اور نظام کی یکسانیت ہے :انگریزی نے مختلف خطوں کے تعلیم یافتہ طبقات کو ایک دوسرے سے اور دنیا سے جوڑ دیا، اور یہی زبان بعد میں آزادی کی تحریکوں کے ابلاغ کا ذریعہ بھی بنی۔ چھٹا اثر پیشہ ورانہ طبقات کا ظہور ہے :وکیل، ڈاکٹر، انجینئر، استاد اور صحافی جیسے جدید پیشے اسی نظام سے پیدا ہوئے جنہوں نے آگے چل کر سماجی اور سیاسی قیادت فراہم کی۔ ان فوائد ہی کی وجہ سے مقامی اصلاح کاروں نے اس نظام کی مخالفت کے بجائے اسے اپنی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

## نوآبادیاتی تعلیم کے منفی اثرات

منفی اثرات مثبت اثرات سے کم گہرے نہیں۔ سب سے بڑا اثر مقصد کی تبدیلی ہے :تعلیم کردار سازی اور علم کی طلب کے بجائے سرکاری ملازمت کا ذریعہ بن گئی۔ نصاب اور امتحان اس طرح بنائے گئے کہ طالب علم دفتر کے کام کے قابل کلرک بنے، اسی لیے اس دور کی تعلیم کو کلرک سازی کا نظام کہا جاتا ہے۔ دوسرا اثر مقامی زبانوں کی پسماندگی ہے۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم اور ترقی کی شرط بنانے سے اردو، فارسی اور علاقائی زبانیں علمی زبان بننے سے محروم رہ گئیں اور علم ایک چھوٹے انگریزی داں طبقے کی اجارہ داری بن گیا۔ اس سے وہ ثقافتی اور نفسیاتی غلامی پیدا ہوئی جس میں اپنی زبان، تاریخ اور تہذیب سے شرمندگی اور حکمران کی ہر چیز سے مرعوبیت شامل تھی۔ تیسرا اثر تعلیم کی دوئی ہے :ایک طرف انگریزی اسکولوں کا مہنگا نظام اور دوسری طرف فرسودہ وسائل والے دینی مدارس؛ اس تقسیم نے معاشرے میں دو ذہنی دنیائیں پیدا کر دیں جن کے درمیان مکالمہ آج تک دشوار ہے۔

چوتھا اثر معاشرتی تقسیم کا ہے۔ انگریزی تعلیم شہروں اور مالدار طبقات تک محدود رہی؛ دیہات اور غریب آبادی اس سے محروم رہی، یوں تعلیمی فرق نے طبقاتی فرق کو مزید گہرا کیا۔ شرح خواندگی بھی نوآبادیاتی دور کے اختتام تک نہایت کم رہی کیونکہ حکومت کی دلچسپی عوامی تعلیم کے بجائے محدود انتظامی طبقہ تیار کرنے میں تھی۔ پانچواں اثر

نصاب کی بیگانگی ہے :تاریخ، ادب اور اخلاقیات میں یہاں کے ہیروز اور اقدار کے بجائے حکمران قوم کے نقطۂ نظر کو پڑھایا گیا، جس سے مقامی طالب علم اپنی جڑوں سے کٹتا چلا گیا۔ چھٹا اثر تحقیقی روح کی کمزوری ہے؛ امتحان پر مبنی نظام نے رٹے، نوٹس اور ڈگری کی دوڑ کو فروغ دیا اور اصلی تحقیق و تخلیق پس منظر میں چلی گئی۔ یہ وہ مسائل ہیں جو آزادی کے بعد بھی ہمارے نظام میں کم و بیش برقرار رہے، کیونکہ ڈھانچہ بدلا مگر اس کے پیچھے کارفرما سوچ مکمل طور پر تبدیل نہ ہو سکی۔

## نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ نوآبادیاتی دور نے برصغیر میں جدید تعلیم کا دروازہ کھولا :جدید علوم، جامعات، چھاپہ خانہ، خواتین کی تعلیم اور پیشہ ورانہ طبقات اسی دور کی دین ہیں، اور اصلاحی تحریکوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قوم کو بیدار بھی کیا۔ لیکن یہ نظام نوآبادیاتی مقاصد کے تابع تھا، اس لیے اس نے علم کو ملازمت سے جوڑا، مقامی زبانوں اور دینی تعلیم کو پس پشت ڈالا، معاشرے کو دو تعلیمی دنیاؤں میں بانٹا اور ذہنی مرعوبیت پیدا کی۔ آج کی تعلیمی اصلاح کا اصل کام یہی ہے کہ جدید علوم کی توسیع کو برقرار رکھتے ہوئے تعلیم کو اپنے مقاصد، زبانوں اور اقدار سے دوبارہ جوڑا جائے تاکہ نوآبادیاتی ورثے کے منفی اثرات کا ازالہ ہو سکے۔

# سوال نمبر :5 مسلم مفکرین کے تعلیمی تصورات اور موجودہ دور میں ان کی معنویت : تنقیدی نوٹ 20) نمبر(

**سوال نمبر :5 مسلم مفکرین کے تعلیمی تصورات کی موجودہ دور میں معنویت پر تنقیدی نوٹ لکھیں۔(20)**

## تعارف

مسلم تہذیب کی علمی تاریخ میں ایسے مفکرین کی طویل فہرست موجود ہے جنہوں نے تعلیم کے مقصد، نصاب، استاد، طالب علم اور تدریسی طریقوں پر گہری فکر پیش کی۔ فارابی، ابن سینا، امام غزالی، ابن خلدون، شاہ ولی اللہ، سرسید احمد خان اور علامہ اقبال جیسے مفکرین کے تعلیمی تصورات صدیوں تک عملی رہنمائی کرتے رہے۔ سوال یہ ہے کہ آج کے دور میں، جب تعلیم ٹیکنالوجی، عالمی مقابلے اور مادی اقدار کے دباؤ میں ہے، ان تصورات کی کیا معنویت باقی ہے؟ کیا یہ محض تاریخ کا حصہ ہیں یا آج کے بحرانوں کا علاج بھی ان میں موجود ہے؟ اس تنقیدی نوٹ میں پہلے اہم

مفکرین کے تصورات کا خلاصہ پیش کیا جائے گا، پھر ان کی موجودہ معنویت کا جائزہ لیا جائے گا اور آخر میں وہ تنقیدی حدود بھی بیان ہوں گی جنہیں نظر انداز کرنا درست نہیں، کیونکہ کسی فکر کی حقیقی قدر اسی وقت سامنے آتی ہے جب اسے تمجید کے بجائے جانچ کر اپنایا جائے۔

## اہم مسلم مفکرین کے تعلیمی تصورات

امام غزالی) وفات1111 ء (مسلم تعلیمی فکر کے سب سے نمایاں نام ہیں۔ ان کے نزدیک علم کا مقصد قربِ الٰہی اور آخرت کی تیاری ہے اور وہ علم جس سے عمل اور اخلاق پیدا نہ ہو وہ حجاب بن جاتا ہے۔ غزالی نے علوم کی درجہ بندی کی، استاد اور شاگرد دونوں کے آداب بیان کیے اور اس بات پر زور دیا کہ استاد شاگرد کو اپنا بیٹا سمجھے، اس کی استعداد کا لحاظ کرے اور نصیحت میں نرمی اختیار کرے۔ ابن خلدون) وفات1406 ء (نے تعلیم کو ایک فن قرار دیا اور تدریج کا اصول دیا :مضمون کو تین مراحل میں آسان سے مشکل کی طرف پڑھایا جائے، طالب علم پر اس کی استعداد سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے اور سختی سے پرہیز کیا جائے کیونکہ سخت سیکھنے والے کو جھوٹ اور مکاری سکھاتی ہے۔ یہ اصول جدید تعلیمی نفسیات کے نتائج سے حیران کن حد تک ہم آہنگ ہیں۔ ابن سینا نے بچے کی جسمانی و ذہنی نشوونما، اجتماعی تعلیم اور پیشے کے انتخاب میں رجحان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ فارابی نے مثالی ریاست میں تعلیم کو شہریوں کی سعادت کا ذریعہ قرار دیا اور حکمران و معلم کے کردار کو جوڑا۔

بعد کے ادوار میں شاہ ولی اللہ نے علوم کی تجدید، ترجمے کی اہمیت اور تعلیم کو سماجی اصلاح سے جوڑنے کی فکر دی؛ قرآن کا فارسی و اردو ترجمہ اسی عوامی تعلیم کی سوچ کا حصہ تھا۔ سرسید احمد خان نے نوآبادیاتی دور میں مسلمانوں کو جدید سائنس اور انگریزی تعلیم کی طرف بلایا مگر ساتھ ہی اخلاقی تربیت اور مذہبی شناخت کی حفاظت پر بھی زور دیا۔ علامہ اقبال نے خودی کا تصور پیش کر کے تعلیم کا مقصد ایسی شخصیت کی تعمیر قرار دیا جو تخلیقی، خوددار اور عمل پسند ہو؛ انہوں نے مغربی تعلیم کی اندھی تقلید پر تنقید کی اور اسے مردہ دلوں کی مشین قرار دیا۔ ان سب مفکرین میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ تعلیم کو انہوں نے محض اطلاع نہیں بلکہ انسان سازی سمجھا، علم و عمل کو لازم و ملزوم رکھا اور استاد کو معاشرے کا معمار مانا۔

**جدول :1 مسلم مفکرین اور ان کے نمایاں تعلیمی تصورات**

| مفکر | نمایاں تعلیمی تصور | موجودہ معنویت |
|---|---|---|
| امام غزالی | علم و عمل کا اتحاد، اخلاق و تزکیۂ نفس مرکز | کردار سازی اور اخلاقی تعلیم کی بنیاد |
| ابن خلدون | تدریج، استعداد کا لحاظ، سختی سے پرہیز | جدید تدریسی نفسیات سے ہم آہنگ اصول |
| ابن سینا | نشوونما کے مراحل، رجحان کے مطابق پیشہ | رہنمائی و مشاورت اور بچہ مرکز تعلیم |
| شاہ ولی اللہ | علوم کی تجدید، ترجمہ و عوامی تعلیم | مادری زبان اور سماجی اصلاح سے ربط |
| سرسید احمد خان | جدید علوم کے ساتھ شناخت کی حفاظت | سائنس اور اقدار کے توازن کا نمونہ |
| علامہ اقبال | خودی، تخلیق اور مقصدیت | نوجوانوں میں خودداری و قیادت کی روح |

## موجودہ دور میں معنویت

ان تصورات کی پہلی معنویت آج کے اخلاقی بحران کے تناظر میں ہے۔ موجودہ تعلیم معلومات اور مہارت میں آگے ہے مگر دیانت، ہمدردی اور ذمہ داری جیسی صفات میں پیچھے رہ گئی ہے۔ غزالی کا علم و عمل کا اصول اور اخلاق کو تعلیم کا ثمرہ قرار دینا اسی خلا کو پر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اگر ہمارے نصاب اور جائزے میں کردار کو وہی مقام ملے جو مفکرین نے دیا تھا تو بدعنوانی اور پیشہ ورانہ بددیانتی جیسے مسائل کی جڑ کٹ سکتی ہے۔ دوسری معنویت تدریسی طریقوں کے شعبے میں ہے۔ ابن خلدون کا تدریج، استعداد کا لحاظ، تکرار اور سختی سے پرہیز آج کے بچہ

مرکز تعلیمی نظریات کی بنیادوں سے ملتا ہے؛ اساتذہ کی جدید تربیت میں ان اصولوں کا حوالہ ہمارے اساتذہ کو اپنی روایت سے جوڑتا اور ان کے اعتماد میں اضافہ کرتا ہے۔

تیسری معنویت شناخت اور اعتماد کی بحالی ہے۔ عالمی نصابوں اور غیر ملکی ماڈلز کے سیلاب میں طالب علم اکثر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ علم صرف مغرب کی میراث ہے۔ اپنے مفکرین کے تصورات سے آگاہی اسے بتاتی ہے کہ تدریس، نفسیاتِ تعلیم اور نصاب سازی میں اس کی اپنی تہذیب کا حصہ موجود ہے، جس سے ثقافتی خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ چوتھی معنویت اقبال کے تصورِ خودی میں ہے جو آج کے نوجوان کو نقل اور مرعوبیت کے بجائے تخلیق، خودداری اور مقصدیت سکھاتا ہے؛ یہ تصور انٹرپرینیورشپ، قیادت اور کردار کی جدید گفتگو سے بھی جُڑتا ہے۔ پانچویں معنویت تعلیم کے مقصد کی اصلاح ہے :سرسید کی جدید علوم کی دعوت اور دینی شناخت کی حفاظت کا توازن آج بھی اسی دوراہے کا جواب ہے جس پر مسلم معاشرے کھڑے ہیں کہ ٹیکنالوجی میں آگے بڑھیں مگر اقدار نہ کھوئیں۔ ان پہلوؤں سے واضح ہوتا ہے کہ مسلم مفکرین کے تصورات عجائب گھر کی شے نہیں بلکہ زندہ رہنمائی ہیں۔

## تنقیدی جائزہ :حدود اور احتیاطیں

تاہم تنقیدی نوٹ کا تقاضا ہے کہ ان تصورات کی حدود کو بھی دیانت داری سے بیان کیا جائے۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ مفکرین اپنے اپنے ادوار کے بچوں، اداروں اور سماجی حالات کے لیے لکھ رہے تھے۔ ان کے دور میں نہ لازمی عوامی تعلیم کا نظام تھا، نہ لاکھوں طلبہ کے اسکول، نہ ڈیجیٹل ذرائع اور نہ خواتین کی تعلیم کا وہ پھیلاؤ جو آج ہے۔ اس لیے ان کے اصولوں کو لفظ بہ لفظ آج کے نظام پر منطبق کرنا درست نہیں؛ اصول لیے جائیں، ان کی عملی صورتیں نئی ایجاد کی جائیں۔ دوسری تنبیہ یہ ہے کہ بعض تصورات مخصوص مذہبی و فلسفیانہ پس منظر رکھتے ہیں، جیسے غزالی کی علوم کی درجہ بندی میں بعض دنیوی علوم کے بارے میں محتاط رویہ؛ آج سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت کے پیش نظر اس درجہ بندی کو نئے سرے سے سمجھنا ہوگا ورنہ طالب علم غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ روایت سے محبت بعض اوقات جامد تقلید میں بدل جاتی ہے، جہاں ہر مسئلے کا حل پرانی کتابوں میں ڈھونڈا جاتا ہے اور نئی تحقیق کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ مفکرین کی اصل روح یہ نہیں تھی؛ ابن خلدون اور غزالی خود اپنے دور کے سب سے بڑے ناقد اور مجدد تھے۔ چوتھی حدود یہ ہے کہ ان تصورات کو نظام میں ڈھالنے کے لیے تحقیق درکار ہے :مثلاً خودی یا تزکیے جیسے تصورات کو نصاب، استاد کی تربیت اور جائزے کی قابلِ عمل صورت

دینا آج کے ماہرین کا کام ہے جو ابھی ناکافی ہوا ہے۔ پانچویں نکتہ یہ ہے کہ ان مفکرین کی معنویت کا دعویٰ اسی وقت وزنی ہوگا جب اسے جدید تعلیمی تحقیق کے ساتھ مکالمے میں پیش کیا جائے، نہ کہ صرف تقریری مقابلوں میں۔ اس متوازن رویّے سے ہی روایت زندہ رہتی ہے :نہ اندھی تقلید، نہ بے جا رد، بلکہ اصولوں کی حفاظت کے ساتھ صورتوں کی تجدید۔

## نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ مسلم مفکرین کے تعلیمی تصورات موجودہ دور میں گہری معنویت رکھتے ہیں :علم و عمل کا اتحاد، اخلاق کی مرکزیت، تدریج و استعداد کا لحاظ، استاد کا مرتبہ اور کردی و شناخت کی تعمیر وہ اصول ہیں جن کی آج کے تعلیمی نظام کو اشد ضرورت ہے۔ ساتھ ہی تنقیدی دیانت کا تقاضا ہے کہ ان تصورات کو ان کے تاریخی سیاق کے ساتھ سمجھا جائے، ان کی عملی صورتیں جدید تحقیق کی مدد سے نئے سرے سے وضع کی جائیں اور جامد تقلید سے بچا جائے۔ اسی صورت میں یہ ورثہ ماضی کی یادگار کے بجائے مستقبل کی تعمیر کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com